

## ہندوستان میں جدید عربی زبان و ادب کا پہلا کار:

### علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

ابوسفیان اصلاحی ۵

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کی جامع الصفات اور مختلف الجہات شخصیت کا احاطہ اگر مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں ہے۔ ان کی اس آفاقی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں ان کے اساتذہ کرام اور ذاتی مطالعے کے ساتھ سرسید اور علی گڑھ کا کردار بہت واضح رہا ہے۔ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں، اپنے افکار اور اپنی فتوحات کے ان مٹ نہ سکتے نقوش چھوڑے ہیں۔ جو ارباب علم و فضل کے لیے راہ نما اصول ہیں۔ اردو زبان کو علم و تحقیق کی زبان بنانے اور اردو تنقید کے اصول و ضوابط کے تعین میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ فارسی شعرا کے مقام و مرتبے کی توضیح میں شعر الجعم ایک عمدہ تحقیقی کاوش ہے۔ اسی طرح عربی زبان و ادب کے ارتقا میں آپ کی نگارشات عالیہ کبھی بھی طاق نسیاں کی نذر نہیں ہو سکتیں۔ ہندوستان میں جدید عربی زبان و ادب کے رواج دینے میں آپ کو اولیت حاصل ہے۔ وہ امت مسلمہ کو اس زبان سے اس لیے جوڑنا چاہتے تھے کہ اس کا سارا سرمایہ اسی زبان میں ہے، قرآن کریم اور سیرت پاک کے اسرار و موزا اسی زبان سے وابستہ ہیں، جس کے بغیر تراث اسلامی تک رسائی ناممکن ہے۔ اس لیے انھیں یہ فکر ہمیشہ دامن گیر رہی کہ امت کا رشتہ اس سے کم زور نہ پڑنے پائے۔ روم و مصر اور شام کے سفر کے بعد اس فکر میں مزید شدت آتی گئی اور یہاں تک کہ گئے کہ اگر ہم نے جدید عربی زبان و ادب کی کروٹوں کو محسوس نہ کیا تو عربوں سے ہمارا رشتہ کٹ جائے گا، کیوں کہ جدید عربی زبان میں صنعت و حرفت کی ترقی کی وجہ سے تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ نئی نئی اصطلاحات، نئے نئے الفاظ اور تراکیب و تعبیرات ڈھل رہی تھیں، اگر ہماری ان سے ناآشنائی رہی تو عربوں سے ہمارا دینی، ثقافتی اور لسانی رشتہ منقطع ہو جائے گا اور ملکی سطح پر تجارتی روابط بھی منقطع ہو جائیں گے۔ مولانا نے سفر نامہ روم و مصر و شام میں اس موضوع کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔<sup>(۱)</sup>

۵ پروفیسر، شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ (asislahi@gmail.com)

۱- دیکھیے: شبلی نعمانی، سفر نامہ روم و مصر و شام (اعظم گڑھ: دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی)۔

مولانا شبلی نے ہندوستان میں جدید عربی زبان کے ارتقا کے لیے کئی پیش بندیاں کیں۔ ایک تو محمد بن اینگلو اور نیشنل کالج میں ”لجنة الأَدب“<sup>(۲)</sup> کے نام سے ۱۸۹۳ء میں ایک عربی سوسائٹی قائم کی جو ہندوستان کی اولین عربی انجمن تھی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں کہیں جدید عربی زبان و ادب کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ آواز اس شخص کے ادارے سے بلند کی گئی جسے انگریزوں کا پٹھو کہا جاتا ہے اور مشرقی تہذیب و ثقافت کا دشمن بتایا جا رہا ہے، جب کہ سرسید کی تحریروں میں یہ شہادت موجود ہے کہ انھوں نے ہمیشہ عربی اور فارسی زبان کو اولیت دی اور اپنے ادارے میں تمام طلبہ کے لیے لازم قرار دیا کہ ان دونوں زبانوں میں سے ایک کا پڑھنا ضروری ہے اور یہ وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ محمد بن اینگلو اور نیشنل کالج کے اولین شعبوں میں عربی اور فارسی کے شعبے بھی شامل ہیں۔ ”لجنة الأَدب“ ایک ایسی ادبی و لسانی انجمن تھی جس میں صرف عربی زبان کا گزر تھا، اس کی تمام کارروائیاں عربی میں ہوتیں، یہی اس کی پہچان اور اساسی شناخت تھی۔ مقالات، تقاریر اور قصائد عربی زبان میں ہوتے۔ نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی داؤد اور مولانا حمید الدین فراہی وغیرہ اپنی نگارشات اور شاعری وغیرہ اسی انجمن کے زیر سایہ پیش کرتے۔ علامہ شبلی نعمانی کو جب شمس العلماء کا خطاب ملا تھا تو اس انجمن کی طرف سے ایک تہنیتی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں کئی تقاریر اور تہنیتی قصائد ان کے اعزاز میں پیش کیے گئے تھے۔

آپ کے سفر روم و مصر و شام کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ وہاں سے بے شمار جرائد و رسائل ہندوستان آنے لگے۔ ان رسائل کی وجہ سے ہندوستانی علمائے کرام اور طلبہ مدارس میں ایک علمی بیداری اور لسانی تحریک پیدا ہوئی۔ ان مصری جرائد و رسائل کے مقالات اردو میں منتقل کیے جانے لگے جس کی وجہ سے اردو زبان، نئے نئے افکار و خیالات سے آباد ہونے لگی۔ وہاں کی شخصیات اور ان کی علمی خدمات کو بھی اردو زبان کا حصہ بنایا گیا۔ آپ کے تلامذہ نے اس میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تعلق سے الہلال اور الندوة کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ الہلال میں مصری اہل قلم کی بے شمار تحریریں پیش کی جاتیں، بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ الہلال نے ہندوستان میں جدید عربی زبان و ادب کے تعارف میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شام و مصر سے آنے والی مطبوعات کا اس میں تعارف پیش کیا جاتا۔ آپ کی جن ارباب فکر و نظر نے اتباع کی ہے ان میں ایک نمایاں نام مولانا ابو الکلام آزاد کا ہے۔ انھوں نے مولانا کی فکری اور صحافتی تربیت پر خصوصی توجہ مبذول کی، کیوں کہ انھیں مولانا کی عبقریت کا اندازہ تھا

۲۔ ابوسفیان اصلاحی، ”علامہ شبلی اور عربی زبان و ادب“ فکر و نظر، شبلی نمبر، علی گڑھ (جون ۱۹۹۶ء)، ۲۸۳-۲۸۵۔

جس کا اظہار انھوں نے مولانا فراہی سے بھی کیا تھا کہ یہ (مولانا آزاد) تم سے زیادہ ذہین ہیں۔ ہندوستانی مفسرین میں دو نام ایسے ہیں جن کے ہاں تفکر قرآن کا نیا انداز پایا جاتا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی کی نظام القرآن اور مولانا آزاد کی ترجمان القرآن میں کچھ نئی چیزیں ملتی ہیں ورنہ بقیہ اردو تفاسیر میں بالعموم دیگر عربی تفاسیر کی چیزوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ مجلہ الندوۃ کی ادارت میں مولانا کو اس لیے رکھا گیا تھا کہ ان کی صحافتی لیاقت کو ایک جہت مستقیم دی جاسکے۔ بہر حال آپ کی کوششوں سے اس جوہر خالص کی چمک کو ہندوستان میں محسوس کیا گیا۔ آپ کو احساس تھا کہ عربوں سے ہمارا رشتہ منقطع نہ ہونے پائے، اسی لیے ان کے اس احساس کے تحفظ کے لیے مولانا کی جولانیاں الہلال میں نمایاں ہوئیں اور اس احساس کے مزید استحکام کے لیے معروف مجلے ثقافتہ الہند کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ ہندوستان اور عرب دنیا کے مابین پل کی مانند ہے جس کے توسط سے ہندوستانی ثقافت عربوں کے سامنے پیش کی گئی، نیز ہندو عرب کے قدیم تجارتی و ثقافتی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی۔

بالعموم یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہندوستان میں جدید عربی زبان و ادب کا بانی ندوۃ العلماء ہے جب کہ حقیقت میں ادارہ سرسید ہے اور اسے جدید عربی زبان و ادب کا مرکز بنانے میں علامہ شبلی کی کوشش کا دخل ہے۔ ادارہ سرسید کے بعد جدید عربی زبان و ادب کو بلندیوں پر پہنچانے کا سہرا ندوۃ العلماء ہی کے سر ہے۔ یہ ایک طویل موضوع ہے، لیکن اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہ بتانا ضروری ہے کہ انھوں نے مولانا عبدالحی لکھنوی کو بھی یہ تحریر کیا کہ طلبہ کو اس طرح سے تربیت دی جائے کہ وہ عربی میں اپنے مافی الضمیر کی نمائندگی کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ندوہ میں سید رشید رضا مصری کی آمد پر سید سلیمان ندوی نے عربی زبان میں ایسی شعلہ بیانی کا ثبوت دیا تھا کہ رشید رضا مصری بھی ”قد أحسنت قد أحسنت“ بول پڑے۔ شبلی ہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ سید صاحب عربی تقریر اور تحریر دونوں پر قادر تھے۔ چنانچہ مولانا حمید الدین فراہی کے انتقال پر آپ نے عربی زبان میں ایک تحریر رقم کی جو الإمعان فی أقسام القرآن کی ایک ابتدائی اشاعت میں شامل ہوئی تھی۔<sup>(۳)</sup> یہ ایک قابل دید تحریر ہے جس میں فصیح زبان کے زبردست بہاؤ کے ساتھ ساتھ ان شخصیات کے باہمی تعلق کی نوعیت کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ علامہ نے اپنے دو شاگردوں مولانا فراہی اور سید سلیمان ندوی کے ذریعے عربی زبان و ادب میں ایک انقلاب

۳- دیکھیے: حمید الدین فراہی، الإمعان فی أقسام القرآن (قاہرہ: المطبعة السلفية، ۱۹۳۰ء)۔

برپا کیا۔<sup>(۴)</sup> مولانا فراہی نے تفسیر قرآن، استشہاد بکلام العرب، تحقیق مفردات اور بلاغت میں نہ جانے کتنے سنگ ہائے میل قائم کیے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے مولانا فراہی کو برادری کا تاج قرار دیا۔<sup>(۵)</sup> سیرت النبی اور شعر الجہم کی مختلف بحثوں میں علامہ نے اپنے شاگرد سے استفادہ کیا۔ جس کی شہادت مکاتیب شبلی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سیرت کے یہ مباحث قرآنیات اور عربی زبان و ادب کے پہلو سے بھی معرکہ آرا ہیں۔ علامہ کی خواہش تھی کہ ان کے شاگرد کو دنیا جانے، لیکن مولانا کو دنیاوی عزت و شہرت سے بے زاری تھی۔ علامہ نے اپنے خطوط اور اپنے مقالات میں جگہ جگہ شاگرد کی عبقریت کا اعتراف کیا۔ اسی تناظر میں تفسیر نظام القرآن اور جمہرة البلاغة کی خصوصیات پر اظہار خیال کیا۔

جمہرة البلاغة کے دو بنیادی نکات ہیں: ایک تو اسطو کے بلاغی نظریات کو شواہد کی روشنی میں کالعدم قرار دیا گیا۔ اسطو نے محاکات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا تھا کہ واقعے کی اس طرح تصویر کشی کی جائے کہ وہ نظروں میں گھومنے لگے۔ مولانا کا خیال ہے کہ اسطو کی محاکات فرضی لفظوں پر مبنی ہے، کیوں کہ اس کا خیال ہے کہ واقعے کو لطف اندوز بنانے کے لیے صداقت کو توڑا موڑا بھی جاسکتا ہے، یعنی واقعے کو گھٹانا اور بڑھانا دونوں کی گنجائش ہے تاکہ قارئین کی دل چسپی میں اضافہ کیا جاسکے۔ اسطو کے خیال میں شاعری لطف انگیزی کا نام ہے، بلاغت ایک ایسی مصوری ہے جس میں کذب بیانی، سخن سازی اور مبالغہ آمیزی کا جواز ہے۔ یونانی شاعری صرف مذاقہ جلسوں کو گرم کرنے کے لیے کی جاتی رہی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ یونانی شعرا کی شاعری سے اس کی واقفیت بالکل نہ تھی۔ ہومر، سوفاکلیس اور دیگر یونانی شعرا کی شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے اصول بلاغت کو ترتیب دیا۔ سوفاکلیس کا خیال ہے کہ ”میں نے اس کا حلیہ ویسا بیان کیا جیسا ہونا چاہیے نہ کہ ویسا جس طرح کہ حقیقتاً ہے۔“ عربوں کی بلاغت کا سارا انحصار بلاغت اسطو پر تھا۔ جس کی وجہ سے انھیں کہنا پڑا ”أحسن الشعراء أكذبه“ یعنی سب سے حسین شعر سب سے جھوٹا ہے۔ مولانا نے اسطو کے بلاغی نظریات کی تردید کے بعد قرآنی بلاغت کا تصور پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس بلاغت کا تمام دار و مدار صداقت پر ہے۔ قرآن کریم دنیا کی سب سے عظیم ادبی کتاب ہے جس کے متعلق ارشادِ ربانی ہے: ﴿ قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَيَّ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ

۴- وضاحت کے لیے دیکھیے: ابوسفیان اصلاحی، ”مولانا فراہی اور سید سلیمان ندوی“ اساطین عربی زبان و ادب (دہلی: اردو

پرنٹرز، ۲۰۰۳ء)، ۸۳-۱۱۳۔

۵- شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، ترتیب: مولانا مسعود علی ندوی (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۲۷ء)، ۲: ۱۶۔

لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَتْ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴿١﴾ (کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور کل جنات مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کے مثل لانا ناممکن ہے؟ گو وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے مدد گار بھی بن جائیں۔)“ اسی مثالی اور الہامی کتاب میں آں حضور ﷺ کو بلیغ کہا گیا ہے یعنی ہر بات کو اتنی صراحت اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ وہ باتیں ذہن نشین ہوتی گئیں اور دشمنان رسول کا دائرہ سمٹتا گیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سے مطالبہ کیا کہ ”فاصدع بہا تو مر“ (جو احکامات تمہیں دیے جا رہے ہیں انہیں کھول کھول کر بیان کرو۔) اسی لیے قرآن کریم میں اس بلیغ عظیم کے پیغام کو ”بلاغِ مبین“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔<sup>(۷)</sup> مولانا نے ایک طرف جہاں مولانا فراہی کی بلاغی آرا کا تعارف کرایا ہے، وہیں خود بھی ”فنِ بلاغت“ کے عنوان سے ایک جامع مقالہ تحریر کیا ہے جس میں مسلمانوں کو فنِ بلاغت کا موجد قرار دیا گیا ہے۔

یہاں وضاحت ضروری ہے کہ عربی لٹریچر میں جھہرۃ البلاغۃ ایک منفرد شان کی کتاب ہے۔ اسی لیے مولانا ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء) کو کہنا پڑا کہ اس کتاب کو عربوں کے مابین عام کیا جائے تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ مولانا نے کس طرح بلاغت عربیہ کو عربوں ہی کے ذوق اور قرآنی ذوق کی مدد سے سمجھا ہے اور اس کتاب میں کیا انفرادیت ہے۔ پروفیسر محمد راشد ندوی اور ڈاکٹر عبدالباری مرحوم نے اپنے مقالات میں جھہرۃ البلاغۃ کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔<sup>(۸)</sup> ضرورت ہے کہ اسے اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ اربابِ ذوق اس کے بلاغی نوادرات سے مستفیض ہو سکیں۔ یہاں یہ اشارہ بھی مناسب ہو گا کہ پروفیسر سلیمان بستانی (۱۸۵۶ء-۱۹۲۵ء) نے یونانی شاعر ہومر (Homer) کی الیڈ (Iliad) کو عربی میں منتقل کیا ہے۔<sup>(۹)</sup> علامہ نے اس سعی مشکور کو سراہا۔ بستانی نے دو سو صفحے کا عالمانہ پیش لفظ بھی اس پر رقم کیا ہے جس میں ہومر کی شخصیت اور شاعری پر ارتکاز

۶- القرآن ۱۷: ۸۸۔

۷- شبلی نعمانی، ”نظم القرآن و جھہرۃ البلاغۃ“، مقالات شبلی (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۳۶۹ھ)، ۲: ۱۷-۲۳۔

۸- ان دونوں مضامین کے لیے دیکھیے: علامہ حمید الدین فراہی، حیات و افکار (اعظم گڑھ: دائرہ حمید یہ مدرسہ الاصلاح سرائے میر، ۱۹۹۲ء)، ۵۳۳-۵۶۱۔

۹- ہومر یونانی ادب کی معروف شخصیت ہے، تاہم اس کے تاریخی وجود کے بارے میں آرا مختلف ہیں، نیز اس کے زمانے کا تعین بھی ایک مشکل معاملہ ہے۔ Iliad اور Odyssey، اس کی دو مشہور رزمیات ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ آٹھویں صدی قبل دور مشترک (BCE) میں مکمل ہوئیں۔

ہے، نیز اس کی شاعری کا عربی شاعری سے موازنہ بھی کیا ہے۔ یہ تمام مباحث بستانی کی ادب دوستی اور سخن فہمی کی دلیل ہیں۔ ان دونوں مضامین کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ علامہ فصاحت و بلاغت کے رموز و اسرار سے بہ خوبی واقف تھے۔ یہاں ایک اقتباس نقل کیا جا رہا ہے تاکہ بلاغت کا حقیقی مفہوم آشکار ہو سکے:

اس موقع پر پہنچ کر ایک عام غلطی کا رفع کر دینا بھی ضروری ہے، اکثر لوگ شعر اور نثر بلیغ کو ایک سمجھتے ہیں، چنانچہ قدماء میں اسطو اور متاخرین میں جان مل کا یہی مذہب ہے۔ اسطو کا خیال ہے کہ محاکات کے مختلف طریقے ہیں اور خود کلام جو محاکات کا ایک خاص طریقہ ہے اس میں محاکات کے تین ذریعہ پائے جاتے ہیں: وزن، الفاظ، نغمہ؛ یہ چیزیں تنہا اور کبھی مل کر واردات قلبی کی تصویر کھینچتی ہیں، یہی محاکات شعر ہیں۔ یہ محاکات کبھی صرف الفاظ کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس طرح ستر اط کا مکالمہ اور کبھی الفاظ اور نظم دونوں کے ذریعہ سے؛ وزن، شعر کے لیے کوئی ضروری چیز نہیں، لیکن عام لوگوں نے اس کو شاعری کا ضروری جز قرار دیا ہے۔

اسطو کا خیال اس حد تک صحیح ہے کہ وزن پر شعر کا مدار نہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وزن شعر کے اجزاء میں داخل نہیں، وزن شعر کا جز ہے لیکن چوں کہ کل کے لیے محض ایک جز کافی نہیں ہوتا، اس لیے تنہا وزن سے شعر نہیں بن سکتا، لیکن اسطو کی یہ غلطی ہے کہ وہ ستر اط کے مکالمہ اور ہومر کے کلام دونوں کو شعر قرار دیتا ہے۔<sup>(۱۰)</sup>

علامہ شبلی نعمانی کی عربی تصانیف میں الانتقاد علی تاریخ التمدن الإسلامي، الجزیة، تاریخ

بدء الإسلام، طبقات ابن سعد اور إسکات المتعدی علی انصاف المقتدی شامل ہیں، لیکن یہاں صرف الانتقاد پر قدرے اظہار خیال کی سعی کی جائے گی۔ علامہ کی یہ کتاب دراصل مشہور عربی نثر نگار جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الإسلامي کا جواب ہے۔ یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ الانتقاد اس کی پہلی جلد کا جواب ہے۔ زیدان کی یہ کتاب اتہامات و الزامات کا پلندہ ہے۔ اس میں قرآن کریم، سیرت پاک، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور اموی و عباسی خلفاء کی تصاویر بگاڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عربوں کی تحقیر و تذلیل کی گئی ہے، اموی اور عباسی خلفاء کے متعلق بتایا گیا کہ وہ دین اسلام کی توہین کرتے تھے۔ قرآن کریم اور حریمین کے تقدس کو تار تار کرنا ان کا شیوہ تھا۔ روایات کے باب میں جرجی زیدان کا یہ کہنا تھا کہ کذب و افترا پر مبنی ہیں، اس میں تحریفات کی گئی ہیں۔ اس طرح کے بہت سے بے بنیاد الزامات اسلام پر عائد کیے گئے ہیں۔ مولانا نے ان تمام الزامات کا مدلل جواب دیا ہے۔ عربوں میں کوئی ایسا عالم نہیں تھا جو الزامات کا عالمانہ جواب دیتا۔ اس جواب کی تسوید میں مولانا کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی۔ اس کی تمام تفصیل مکاتیب میں موجود ہیں کہ علامہ کو کن کن

مصائب سے گزرنا پڑا۔ مولانا نے اسے اردو میں بھی منتقل کیا جو المدوہ میں شائع ہوا، لیکن اپنی عربی تحریر کے متعلق بتایا ہے کہ اصل زور اسی میں ہے۔ مولانا کی یہ تحریر مجلہ المنار میں شائع ہوئی تھی جسے مدیر مجلہ رشید رضانی سزاہا۔ اس کے عالمانہ و فاضلانہ انداز کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی یہ قابل ستائش ہے، عجبت کے اثرات سے پاک ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ الانتقاد میں جگہ جگہ رشید رضا کی اصلاحات بھی رہیں لیکن اس کی علمی عظمت مسلم ہے۔ اس طرح کی علمی دست رس صرف علامہ ہی کے یہاں مل سکتی تھی۔ یہاں ایک اقتباس دیا جا رہا ہے تاکہ اس کی علمی قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جاسکے:

أما قول عبد الملك للقرآن ”هذا فراق بيني وبينك“ فحقيقته أن عبد الملك كان قبل الخلافة ناسكًا منقطعًا إلى العبادة لا يشتغل بشيء من الدنيا. قال نافع ما رأيت في المدينة أشد نسكا وعبادة من عبد الملك ولما سألو ابن عمر إلى من يرجع في الفتوى بعدك قال: ولد للمروان. و كان يقول ابن الزناد: الفقهاء في المدينة سبعة أحدهم عبد الملك. وقال الإمام الشعبي ما جالست أحدا إلا وجدت عليه الفضل إلا عبد الملك بن مروان، ذكر كل هذه الأقوال العلامة السيوطي في تاريخ الخلفاء، فلما جاءت الخلافة وهو يقرأ القرآن تصور خطارة الأمر، وأن مثل هذا العب، لا يمكن تحمله إلا المنقطع إليه فقال تحسرا: هذا آخر العهد بك، أي الآن لا يمكن الانقطاع إلى العبادة و قراءة القرآن كما كان دأبي أو لأ، وليس هذا على سبيل الاستهانة بالدين مطلقًا، فإننا نرى اشتغال عبد الملك بالفرائض والسنن فيما بعد فهو يصوم ويصلي ويحج. قال اليعقوبي في تاريخه و أقام الحج للناس في ولايته سنة ٧٢ هـ الحجاج بن يوسف و سنة ٧٣ هـ و سنة ٧٤ هـ الحجاج أيضًا و سنة ٧٥ هـ عبد الملك بن مروان و سنة ٧٦ هـ أبان بن عثمان بن عفان، و سنة ٧٧ هـ أبان أيضًا و سنة ٧٨ هـ و سنة ٧٩ هـ و سنة ٨٠ هـ أبان أيضًا و سنة ٨١ هـ سليمان بن عبد الملك (وسرد باقي السنوات فتركتها) و عبد الملك هو الذي كسا الكعبة الديباج. فهل هذا صنيع من يريد الاستهانة بالحرم؟<sup>(۱)</sup>

قرآن کریم کے متعلق عبد الملک کا یہ اظہار خیال ہے کہ ”میرے اور تمہارے درمیان یہ جدائی ہے“ اس کی حقیقت یہ ہے کہ خلافت سے قبل عبد الملک انتہائی عبادت گزار اور درویش صفت شخص تھا۔ دنیاوی امور سے اسے کوئی دل چسپی

۱۱۔ شبلی نعمانی، ”الانتقاد علی تاریخ التمدن الإسلامي“، مجلة الهند (بولفور بنغال الغربية، الهند)، ۳: ۱-۴؛

نہیں تھی۔ نافع کا کہنا ہے کہ مجھے مدینہ میں عبد الملک سے بڑا عبادت گزار اور درویش کوئی اور نظر نہیں آیا۔ جب ابن عمر سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے بعد فتوے کے سلسلے میں ہم کس سے رجوع کریں تو انھوں نے جواب دیا: مروان کے فرزند سے۔ ابن الزناد کہا کرتے تھے کہ مدینہ میں فقہاسات ہیں، عبد الملک ان میں سے ایک ہے۔ امام شعبی کہتے ہیں کہ عبد الملک بن مروان کو چھوڑ کر میں جس کے پاس بیٹھا مجھے اپنا قد بڑا نظر آیا۔ علامہ سیوطی نے ان تمام اقوال کو اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں نقل کیا ہے۔ تلاوت قرآن کی حالت میں خلافت کا بار جب ان پر آن پڑا تو انھیں معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا کہ اس طرح کے بوجھ کا متحمل وہی شخص ہو سکتا ہے جو اس میں پوری طرح منہمک ہو جائے۔ اس وقت حسرت و یاس کے عالم میں ان کی زبان سے یہ جملے ادا ہوئے کہ یہ تم سے آخری ملاقات ہے۔ یعنی اب سابقہ معمول کے مطابق عبادت اور تلاوت قرآن میں انہماک ممکن نہیں ہو گا۔ ان کا یہ قول دین کی حقارت کے پہلو سے ہرگز نہیں تھا۔ اس لیے کہ فرائض و سنن سے ان کی وابستگی بعد میں ہی قائم رہی۔ نماز روزہ اور حج کی ادائیگیوں کی توں باقی رہی۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ان کی امارت میں ۷۲ھ، ۷۳ھ اور ۷۴ھ میں جارج نے ۷۵ھ میں عبد الملک بن مروان نے ۷۶ھ، ۷۷ھ، ۷۸ھ، ۷۹ھ، ۸۰ھ میں ابان بن عثمان اور ۸۱ھ میں سلیمان بن عبد الملک نے حج کا اہتمام کیا۔ (یعقوبی نے یہ ترتیب تمام سالوں کا ذکر کیا ہے ہم اسے چھوڑتے ہیں۔) عبد الملک ہی وہ شخص ہے جس نے خانہ کعبہ کو ریشم کا غلاف پہنایا۔ کیا جو شخص حرم کی تحقیر کرنا چاہتا ہو وہ اس طرح کا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

الجزیة بھی علامہ کا ایک گراں قدر رسالہ ہے۔ علامہ نے لفظ جزیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہ فارسی

لفظ ”گزنیہ“ کا معرب ہے۔ عام طور سے مستشرقین کا اسلام پر یہ اعتراض ہے کہ اسلامی ریاست میں ذمیین سے جزیہ جبراً وصول کیا جاتا ہے، جب کہ یہ ایک ٹیکس ہے جو ان کی جان اور مال کے تحفظ کے لیے لیا جاتا ہے۔ ذمیین کو ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے، ثقافتی امور اور عبادت کی ادائیگی کے باب میں ان پر کوئی قدغن نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے عبادت خانے بھی تعمیر کر سکتے ہیں۔ جزیہ کا مصارف عامہ میں استعمال ہوتا ہے، اسی طرح سے صدقات کا اصل مصرف معاشرتی امور ہیں جن سے ذمیین بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔ بہر کیف مختلف دلائل و شواہد کی روشنی میں معاندین اسلام کے اعتراضات کو بے بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ یہاں ایک اقتباس نقل کیا جا رہا ہے تاکہ علامہ کا طرز تحقیق منظر عام پر آسکے:

آنحضرت ﷺ و خلفائے راشدین کے جو معاہدے تاریخوں میں منقول ہیں ان میں عموماً پایا جاتا ہے کہ جزیہ ان لوگوں کی محافظت کا معاوضہ تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے والی ایلہ کو جو فرمان جزیہ کا تحریر فرمایا، اس میں یہ الفاظ مندرج فرمائے: یحفظوا أو یمنعوا، یعنی ان لوگوں کی حفاظت کی جائے گی اور دشمنوں سے بچائے جائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کے قریب جو نہایت ضروری وصیتیں کیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ غیر مذہب والے جو ہماری رعایا ہیں، وہ خدا اور رسول کی ذمہ داری ہیں اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے ان کی دشمنوں سے مقابلہ کرنا چاہیے، اس موقع



پر ہم بعض معاہدات اصلی الفاظ میں نقل کرتے ہیں جن میں نہایت صاف اور مصرح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ صرف حفاظت کا معاوضہ تھا اور غیر مذہب والے جو مسلمانوں کی رعایا تھے، یہی سمجھ کر یہ معاوضہ ادا کرتے تھے۔

”هذا كتاب من خالد بن الوليد لصلوبا ابن نسطونا و قومه ابي عاهد تكم على الجزية و المنعة فلك الذمة و المنعة مامننا كم فلنا الجزية و الا فلا، كتب سنة اثنتي عشرة في صفر.“ (یہ خالد بن ولید کی تحریر ہے، صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم کے لیے میں نے تم سے معاہدہ کیا۔ جزیہ اور محافظت پر پس تمہاری ذمے داری اور محافظت ہم پر ہے، جب تک ہم تمہاری محافظت کریں، ہم کو جزیہ کا حق ہے ورنہ نہیں، ۱۳ھ صفر میں لکھا گیا۔)<sup>(۱۲)</sup>

علامہ شبلی نعمانی کا ایک اہم عربی رسالہ تاریخ بدء الإسلام ہے۔ اس میں مختلف سیرتی مآخذ سے مدد لیتے ہوئے آل حضور ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک کے واقعات جمع کیے گئے ہیں۔ یہ ابتدائی درجات کے طلبہ کے لیے انتہائی مفید ہے۔ اس کا اسلوب بیان اور طریقہ پیش کش انتہائی مؤثر ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ آیات کریمہ ذکر کی گئی ہیں، جس کی وجہ سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کی افادیت کے نقطہ نظر سے اسے مولانا حمید الدین فراہی نے فارسی میں منتقل کیا اور میمونہ سلطان نے اسے اردو جامہ پہنایا۔ یہ کتاب کالج کے کورس میں داخل بھی تھی، یہاں اس کا ایک اقتباس مع ترجمہ نقل کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین کو اس زبان اور مقصد و مطلب تک رسائی ہو سکے:

لما دعاهم رسول الله ﷺ إلى التوحيد والإسلام وأنكر عليهم عبادة الأصنام، أخذتهم العزة بالإثم فأعرضوا واستهزءوا وأكثروا من الجدل و اللجاج وتشبثوا بحجج واهية وشبهات ساقطة، فمنهم من يقول ”أجعل الإلهة لها واحداً“ ومنهم من تمسلك بالتقليد الجامد فقال ”ما سمعنا بهذا في آباتنا الأولين بل نتبع ما ألفينا عليه آباتنا فلما أحس منهم الكفر أثبت عليهم حجة الحق باستدلالات لطيفة سهل المأخذ سمع التعاطي لاتبعه عن محجتهم ولا تخرج عن نطاق دركهم، فاستدل على وجود الخالق بشواهد الفطرة و عجائب آثارها.“<sup>(۱۳)</sup>

۱۲- شبلی نعمانی، مقالات شبلی، تریب: مولانا مسعود علی ندوی (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۳۸۳ھ / ۱۹۵۳ء)، ۱: ۲۲۶۔

۱۳- شبلی نعمانی، ”تاریخ بدء الإسلام“، مجلة الهند (بولفور بنغال الغربية، الهند)، ۱: ۳-۲، ۵۰۲-۵۰۳۔

اللہ کے رسول ﷺ نے جب انھیں توحید اور اسلام کی دعوت دی اور بت پرستی کی تکبیر فرمائی تو گھمٹنے انھیں گناہ پر آمادہ کیا۔ انھوں نے اعراض و استہزا کی روش اختیار کی۔ مخاصمت اور دشمنی کی انتہا کر دی۔ کم زور دلائل اور بے بنیاد شبہات کا سہارا لیا۔ بعض نے کہا ”کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک الہ قرار دیا ہے“ کچھ نے تقلید جامد کی روش اختیار کی اور کہا: ”ہم نے اپنے آباؤ اجداد میں اس طرح کی کوئی بات نہیں سنی ہم تو اس چیز کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ جب ان کے انکار و روگردانی کی روش بالکل واضح ہوگی تو آپ ﷺ نے ایسے سادہ، عام فہم اور لطیف استدلال کے ذریعے ان پر حق کی حجت قائم کر دی جو ان کے عقل و فہم کے لیے نارسا نہیں تھی۔ چنانچہ فطرت اور اس کے عجیب و غریب آثار کو خالق کے وجود پر بہ طور دلیل کے پیش فرمایا۔

علامہ کا ایک رسالہ إسکات المعتدي علیٰ إنبات المقتدي ہے۔ یہ کانپور کے مطبع نظامی سے

محرم ۱۳۹۸ء / دسمبر ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس کا شمار علامہ کی ابتدائی تحریروں میں ہوتا ہے۔ جس وقت وہ حنفیت کے پر جوش حامی تھے۔ یہ رسالہ تائید حنفیت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ ایک طرح سے علامہ نے دیگر ائمہ کے مقابلے میں امام اعظم کو اولیت دینے کی کوشش کی ہے۔ علامہ کے ذہن پر امام اعظم کی وہ قدر و منزلت طاری تھی کہ انھوں نے سیرۃ النعمان لکھ کر امام اعظم کی فقہی اور علمی خدمات کا مدلل اعتراف کیا ہے۔ یہ کتاب امام اعظم پر ترتیب دی جانے والی تصانیف میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ بہر کیف موضع بحث میں امام اعظم کے خیال کے مطابق امام کے پیچھے جہری اور سری دونوں نمازوں میں مقتدی کو خاموش رہنا ہے۔ اس کتاب میں اسی نقطہ نظر کی قرآن کریم، احادیث اور دیگر فقہاء کی آرا سے تائید کی گئی ہے۔ یہاں ایک اقتباس کو مع ترجمہ نقل کیا جائے گا تاکہ علامہ کی عربی نگارشات اور مذکورہ نقطہ نظر دونوں کا اندازہ ہو سکے۔

أما المقصود فهو أنه لا يقرأ المؤتمر خلف الإمام لا في الجهرية ولا في السرية، والحجة على ذلك الآية الكريمة (وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا) فإن المطلوب أمران: الاستماع والإنصاف فيعمل بكل منهما، والأول يخص بالجهرية والثاني لا فيجري على إطلاقه، فيجب السكوت عند القراءة مطلقاً كذا في فتح القدير. والمنكرون قد بذلوا سعيهم في هدم بناء الاحتجاج، وإني أذكر ما عرض لهم ثم أبطله بما يكون مسكناً لكل من خاصم وحاج ويظهر لك أن هذا عذب فرات وهذا ملح أجاج، فنقول إنهم تفرقوا في وجه الاعتراض شيعاً فمنهم من أثبت نزول الآية في الخطبة ومنهم من اختار ورودها في كلامهم في الصلوة مع أن سعيهم لا يكاد يرجع إلى طائل فإن العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المعنى، وهذا على سبيل التنزل وإلا فقد اتفق العلماء ومن يعتد به منهم على أن الآية وردت في الصلوة كما نقله البيهقي، ويؤيدك ما

وردت به الأخبار قال علي بن طلحة عن ابن عباس قوله ”إذا قرئ القرآن“ يعني في الصلوة المفروضة، رواه عماد بن كثير في تفسيره وأخرج عبد بن حميد والبيهقي في القراءة عن أبي العالية أن النبي ﷺ كان إذا صلى بأصحابه فقرأ أصحابه فنزلت هذه الآية فسكت القوم.<sup>(۱۳)</sup>

مقصود و مطلوب یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے کسی بھی صورت میں قراءت نہیں کرے گا خواہ جہری نماز ہو یا سری۔ اس کی دلیل آیت کریمہ ”جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو“ ہے۔ آیت کریمہ سے دو چیزیں مطلوب ہیں؛ پہ غور سماعت اور سکوت؛ لہذا ان دونوں میں سے ہر ایک پر عمل کیا جائے گا اور استماع جہری نماز کے ساتھ مخصوص ہے نہ کہ سری نماز کے ساتھ، اس لیے وہ اپنے عموم پر باقی رہے گا اور قراءت کے وقت مطلقاً سکوت واجب ہو گا جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ منکرین نے حجت کی اساس منہدم کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ میں ان کے اعتراضات کو پیش کر کے فریق مخالف کے ہر فرد کی رائے کا مسکت انداز میں ابطال کروں گا جس سے واضح ہو جائے گا کہ ایک طرف چشمہ شیریں ہے اور دوسری طرف نہایت شور و تلخ۔ اعتراض کی رو سے ان کے کئی گروپ ہیں۔ بعض کے نزدیک آیت کا نزول خطبے کے سلسلے میں ہے۔ بعض اسے نماز میں گفت گو سے متعلق قرار دیتے ہیں، حالانکہ ان کی اس کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس لیے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہو گا نہ کہ کسی خاص معنی کا اور یہ بہ منزلہ انحراف ہے، ورنہ علما کی ایک معتد بہ تعداد کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیت کا نزول نماز سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں وارد شدہ اخبار سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ علی بن طلحہ ابن عباس کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ”إذا قرئ القرآن“، یعنی فرض نماز میں جب (جب قرآن پڑھا جائے)۔ عماد بن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس کو بیان کیا ہے اور عبد بن حمید اور بیہقی نے ابو العالیہ سے مروی قراءت میں اس کی تخریج کی ہے کہ آپ ﷺ جب اپنے اصحاب کو نماز پڑھاتے تھے تو صحابہ کرام بھی قراءت کیا کرتے تھے، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ خاموش رہنے لگے۔

علامہ شبلی نعمانی کی علمی خدمات سے واضح ہے کہ وہ تین زبانوں عربی، فارسی اور اردو سے نہ صرف واقف تھے بلکہ تینوں کے مصادر و مراجع آپ کی نظر میں تھے۔ ان کے محاسن اور معائب پر آپ کی نظر تھی۔ شعر العجم اور فارسی کلیات سے آپ کی فارسی دانی کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کی تصانیف، مقالات اور اردو کلیات کی روشنی میں آپ کو اردو ادب کے صف اول کے معماروں میں شمار کرنا درست ہو گا۔ اسی طرح آپ کی عربی تصانیف، عربی خطوط اور عربی شاعری آپ کی اعلیٰ عربیت پر دال ہیں۔ جس طرح آپ نے فارسی اور اردو تنقید کے اصول منضبط کیے، اسی طرح آپ کی خواہش تھی کہ عرب شعرا کے آثار و اقدار کو اس طرح قلم بند کیا

۱۳۔ شبلی نعمانی، ”اسکات المعتدی علی انصاف المقتدی“، مجلۃ الہند (بولفور بنغال الغربیہ، الہند)، ۳: ۱-۴،

جائے کہ وہ شعر العرب کی تاریخ بن جائے۔ علامہ نے موازنہ انیس و دہیر کے افتتاحی کلمات میں عربی اور فارسی کا اس طرح موازنہ کیا ہے کہ پوری شاعری میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کیوں کہ پوری عربی اور فارسی شاعری پر آپ کو دست رس حاصل تھی۔ مولانا کا ایک عمدہ مقالہ ”عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ“ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں شاعری کی جزئیات اور لطائف پر علامہ کی گہری نظر تھی۔ یہاں ایک اقتباس سے آپ کی وسعت مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ علامہ عربوں کی شوریدہ سری اور ستیزہ کاری کا ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ ان کے اشعار میں شجاعت، جان بازی، مخاطبہ نفس، اندھا دھند دلیری کے جو خیالات پائے جاتے ہیں، فارس بلکہ دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہو سکتے، اس قسم کے اشعار کو حماسات کہتے ہیں۔ ان حماسیات کو پڑھو تو یہ عالم نظر آتا ہے کہ جنگل میں شیر گونج رہا ہے، فردوسی نے بھی شاہنامہ میں بڑے بڑے زور کے معرکے لکھے ہیں، لیکن وہ اور دن کے افسانے ہیں، فردوسی داستان گو بن کر ان کو بیان کرتا ہے لیکن عرب کا شاعر جو کہتا ہے، اپنی سرگذشت کہتا ہے اور اس لیے اس کا جو اثر ہے شاہنامہ کا نہیں ہو سکتا۔ عرب میں جو مشہور شاعر گزرے ہیں وہی مشہور بہادر اور جنگ آور تھے، مثلاً امراء القیس، عمرو بن کلثوم، عمرو معدی کرب، اس لیے وہ زبان سے وہی کہتے تھے جو ہاتھ سے کرتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں عجم کے شعراء کی یہ حالت تھی کہ انوری ایک دفعہ ڈاکوؤں میں گھر گیا۔ ایک حکیم صاحب اور ایک درزی بھی ساتھ تھا، سب جان بچا کر بھاگ نکلے، انوری بطور علوم متعارفہ کے کہتا ہے:

حکیم و شاعر و درزی چگونہ جنگ  
کنند<sup>(۱۵)</sup>

۱۵۔ شبلی، مقالات، ۲: ۲۹-۵۰؛ یہ ایک مزاحیہ قطعے کا جز ہے جو مکمل یوں ہے:

من و سہ شاعر و شش درزی و چہار دبیر  
اسیر و خوار بماندیم در کف دو سوار  
دبیر و درزی و شاعر چگونہ جنگ کنند  
اگر چہارہ باشند و چہار ہزار  
(میں، تین شاعر، چھ درزی اور چار ادیب صرف دو سواروں کے  
ہاتھوں پٹ گئے۔ مصنف، درزی اور شاعر کس طرح لڑ سکتے ہیں  
خواہ وہ چودہ ہوں یا چار ہزار۔)

قدیم نسخوں میں ”حکیم“ کا لفظ ملتا ہے۔

علامہ نے شعر العرب کے آغاز میں ان مؤرخین کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے عربی شاعری کے آغاز اور شعر کی خصوصیات پر اپنے خیالات کو قلم بند کیا ہے۔ ابن رشیق کی کتاب العمدة کی ادبی و انتقادی خدمات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ مولانا کی یہ کدو کاوش اگر پائے اختتام کو پہنچ جاتی تو ایک عظیم ملی و ادبی خدمت منظر عام پر آ جاتی۔ آپ کے انتقال کے بعد شعر الہند اور اقبال کامل کے مصنف اور علامہ کے شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر العرب کا بیڑا اٹھایا، لیکن افسوس کہ مولانا بھی اسے تشبیہ تکمیل چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ کیا یہی مناسب ہوتا کہ دارالمصنفین اس ادھورے کام کی تکمیل کرتا، لیکن افسوس کہ طباعت کا کام تو وہاں ہو رہا ہے لیکن تحقیق و تصنیف کا سلسلہ موقوف ہو چلا ہے۔ یہاں شعر العرب کی ایک تصویر پیش کی جا رہی ہے تاکہ علامہ کی آفاقیت اور ابعاد ادبیت کا اندازہ ہو سکے۔ مندرجہ ذیل سطور سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علامہ عربی شاعری کے مزاج اور جہتوں سے بہ خوبی واقف تھے:

عرب کا ملک ہزاروں برس سے موجود ہے، اس کا تمدن بھی کچھ نو عمر نہیں، تاہم تعجب ہے کہ شاعری کا پتہ اسلام سے سو ڈیڑھ برس آگے نہیں چلتا۔ سب سے پہلا شاعر جس سے قصیدہ کی ابتدا ہوئی، مہاہل بن ربیعہ ہے جو امراء القیس کا ماموں تھا۔ فرزدق کہتا ہے: ”ومہلہل الشعراء ذاک الاول۔“

امراء القیس آل حضرت ﷺ سے تقریباً ۴۰ برس پہلے تھا، اس لیے مہاہل کا زمانہ بھی اس کے قریب قریب سمجھ لینا چاہیے۔ یہ بات عرب کی تاریخ کا طغرای زریں ہے کہ وہاں شاعری کی ابتدا شریفانہ اور مردانہ جذبات سے ہوئی۔ ایران کی طرح مداحی اور خوشامد گوئی میں اس کی زبان نہیں کھلی۔ عرب ہمیشہ سے جنگ جو، بہادر، مہمان نواز، سیر چشم، غیور اور بلند ہمت تھے، انھی باتوں کو نظم میں ادا کرتے تھے اور یہی ان کی شاعری تھی۔ کوئی قبیلہ کسی شاعر کی خانہ جنگیوں میں کسی قسم کی مدد کرتا تھا تو شکر یہ کے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے۔ مثلاً امراء القیس نے بنو تمیم کی مدح میں کہا: (۱۶)

أقر حشا امرء القیس بن حجر

بنو تیم مصاییح الظلام (۱۷)

علامہ نے اپنے مقالات میں عربی ادب کی نام و رخصت محمد فرید و جدی کی علمی حیثیت کی تعیین میں ایک مختصر تحریر ترتیب دی ہے جس میں فرید و جدی کو ایک معمولی محقق اور مصنف کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فرید و جدی کی تمام تصانیف کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ

۱۶- شبلی، نفس مصدر، ۲: ۳۰-۳۱۔

۱۷- امری القیس، دیوان امری القیس، مرتبہ: محمد ابوالفضل ابراہیم (مصر: دارالمعارف، ۱۹۵۸ء)، ۱۴۱۔

منفی نقطہ نظر ان کے باب میں نہ قائم کرتے۔ فرید وجدی کا نام جدید عربی ادب کے ان محققین میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کا فلسفیانہ مطالعہ کیا تھا۔ وہ ایک فلسفی تھے، دین اسلام کی فلسفیانہ اقدار سے بہ خوبی واقف تھے۔ استشراق کی دسیہ کاریاں اور فریب کاریاں ان کی نظر میں تھیں، ان کی تصانیف میں ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ مولانا آزاد فرید وجدی کے کمالات اور عالمانہ تحلیل و تجزیے سے باخبر تھے، اسی لیے انہوں نے ان کی کتاب المرأة المسلمة کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ خاکسار نے فرید وجدی کی حکمت و بصیرت کو منظر عام پر لانے کے لیے ایک تحقیقی مقالہ ”فرید وجدی کا جدید عربی ادب میں حصہ“<sup>(۱۸)</sup> تحریر کروایا، نیز باب اردو زبان و ادب کے سامنے ان کی مایہ ناز شخصیت کے تعارف کے لیے ماہ نامہ معارف میں دو قسطوں میں ایک مقالہ ”فرید وجدی اور ان کے افکار“ کے عنوان سے تحریر کیا۔ اس مضمون میں علامہ شبلی کے منفی خیال کا جواب تحریر کیا گیا ہے۔<sup>(۱۹)</sup> یہ سچ ہے کہ جدید عربی ادب کی شخصیات میں انہیں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ نے اپنے سفر نامے میں علی پاشا مبارک (۱۸۲۳ء-۱۸۹۲ء)، علی پاشا ابراہیم (۱۸۸۰ء-۱۹۳۷ء) اور امین بکری پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ علامہ نے حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ تذکرہ نویسی میں انہیں ممتاز مقام و مرتبہ حاصل ہے، لیکن عربی اور نعتیہ شاعری کے حوالے سے انہوں نے مولانا بلگرامی کو ایک معمولی درجے کا شاعر قرار دیا ہے۔ گویا علامہ کے نزدیک وہ ایک تک بند شاعر تھے، زبان و بیان کے اعتبار سے ابداع و ابتکار کا فقدان ہے اور ان کی قوت انتقاد انہیں ”اچھا شاعر“ قرار دینے سے قاصر ہے۔ وہ ایک غیر معمولی عاشق رسول تو ہیں لیکن قابل ذکر شاعر ہر گز نہیں۔ علامہ کا یہ مختصر ترین مضمون ہے لیکن اس کے باوجود مولانا بلگرامی کا پورا شعری قد سامنے آجاتا ہے۔ مناسب ہو گا کہ علامہ کے الفاظ ملاحظہ کر لیے جائیں:

آزاد کا عربی اور فارسی کلام اگرچہ کثرت سے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے چہرہ کمال کا داغ ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب ہیں، نہایت نادر کتب ادیبیہ پر ان کی نظر ہے۔ لغات، اور محاورات ان کی زبان پر ہیں، کلام میں اس قدر عجیبیت ہے کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے۔ ان کو اس پر ناز ہے کہ انہوں نے عجم کے خیالات

۱۸- ڈاکٹر جاوید خان نے یہ مقالہ خاکسار کی زیر نگرانی ترتیب دیا جس پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی۔

۱۹- وضاحت کے لیے دیکھیے: ابوسفیان اصلاحی، ”محمد فرید وجدی اور ان کے افکار“ معارف، اعظم گڑھ (۱۹۹۳ء) ۱۵۳: ۲، ۱۰۹-۱۲۵؛ (۱۹۹۳ء) ۱۵۳: ۴، ۲۷۰-۲۸۵؛ علامہ کی تحریر کے لیے دیکھیے: شبلی، مقالات شبلی (اعظم گڑھ: مطبع

عربی زبان میں منتقل کیے ہیں، لیکن نکتہ سخن جانتے ہیں کہ یہ ہنر نہیں بلکہ عیب ہے۔ ”خط نمودہ ام چشم آسن میں دارم۔“ (۲۰)

یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ بلاد عربیہ کے محققین، ادبا، شعر اور قلم کار حضرات بہ خوبی علامہ کی تحقیقی اور تصنیفی بلندیوں سے واقف تھے۔ علامہ جب مصر پہنچے تو وہاں کے اہل علم نے آپ کی پذیرائی میں کسی کوتاہی کا ثبوت نہیں دیا۔ رسالہ البشیر میں پروفیسر انطون نے آپ کی بلندیوں اور علمی فراست کا ذکر کیا۔ (۲۱)

ازہری شیوخ سے نہ صرف ہم کلام ہوئے، بلکہ انھیں مرعوب بھی کیا، نیز بتایا کہ ازہری شیوخ قوم کے نونہالوں کو برباد کر رہے ہیں، ان کا سارا انحصار حواشی اور شروح پر ہے۔ (۲۲) جامعہ ازہر تقلید کا مرکز ہے، تحقیق سے انھیں انقباض ہے۔ شیخ محمد عبدہ نے جامعہ ازہر کو تقلید جامد سے نکال کر راہ تحقیق پر ڈالا۔ ان کے شاگرد رشید رضا سے علامہ کے گہرے مراسم رہے۔ اسی بنیاد پر وہ ندوۃ العلماء آئے۔ ان کے مجلے المنار میں آپ کی تحریریں اور خطوط شائع ہوئے۔ انھی تعلقات کے نتیجے میں علامہ رشید رضا کی شناسائی مولانا فراہی کے علمی کام سے ہوئی اور انھوں نے مولانا فراہی کی تفسیر نظام القرآن کے بعض اجزا پر تبصرہ بھی کیا۔ (۲۳) جس میں مولانا کے تفردات اور نظریہ نظم قرآن کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا۔ یہاں یہ تذکرہ ہرگز نامناسب نہ ہو گا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ندوۃ العلماء، دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح نے عربی زبان و ادب کی ایک قابل قدر دنیا آباد کی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبہ عربی اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی اپنی تحقیقی خدمات کی وجہ سے شہرت کی بلندیوں پر فائز ہے۔ یہاں کے یورپین اور ہندوستانی اساتذہ کرام خصوصاً عبدالعزیز میمن اپنے تحقیقی نوادر کی وجہ سے دنیا سے عربی میں انتہائی مقبول تھے۔ (۲۴) ندوۃ العلماء اس وقت جدید عربی زبان و ادب کا منبع ہے۔ مولانا عبدالحی کی نزہۃ

۲۰۔ شبلی، مقالات، ۵: ۱۲۲۔

۲۱۔ شبلی نعمانی، سفرنامہ، ۱۳۸۔

۲۲۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: شبلی نعمانی، نفس مصدر، ۱۳۷-۱۷۵۔

۲۳۔ دیکھیے: رشید رضا ”تقریظ المطبوعات الجدیدة (نظام القرآن و تأویل الفرقان بالفرقان)“، مجلۃ المنار

(مصر)، ۱۲: ۱۳۲۷ھ، ۱۳۵۔

۲۴۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: ابوسفیان اصلاحی، علامہ عبدالعزیز میمنی، دراسۃ تحلیلیہ (علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،

۲۰۱۳ء) ۵۰-۷۶؛ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: محمد راشد شیخ، علامہ عبدالعزیز میمن، سوانح اور علمی خدمات (کراچی:

قرطاس، ۲۰۱۱ء)، ۳۲-۳۳۔

الخواطر اور الثقافة الإسلامية في الهند عالمی معیار کی کتابیں ہیں۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی کی یگانہ روزگار کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين عربوں کے لیے باعث اشتیاق ہے۔ دارالمصنفین سے اِمعان فی اقسام القرآن اور أبو العلاء المعري و ما إليه کی اشاعت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں نے دنیائے علم کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، دروس الأدب اور لغات جدیدہ نے عربی زبان و ادب کے گوشوں کو شائقین ادب کے سامنے پیش کیا۔ مدرسۃ الاصلاح کے فضلا نے عربی زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا، بالخصوص مولانا محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی نے مفردات القرآن اور الانتقاد علی تاریخ التمدن الإسلامي کی تحقیق و تدوین سے دنیائے عربی میں اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر محمد اسلم اصلاحی نے اپنی مختلف نگارشات سے عربی زبان و ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ مذکورہ سطور صرف اس لیے تحریر کی گئیں کہ ان تمام علمی اور تحقیقی فتوحات کے پیچھے علامہ شبلی نعمانی کی کاوشیں کار فرما ہیں۔ انھوں نے ان اداروں کو اپنے خون جگر سے سینچا اور اپنے تلامذہ کو علم و تحقیق کا شیدائی بنایا۔ یہی توجہ ہے کہ مولانا دریابادی نے انھیں مصنف اور مصنف گر کہا ہے۔<sup>(۲۵)</sup> مہدی افادی نے انھیں تاریخ کا معلم اول قرار دیا ہے<sup>(۲۶)</sup> اور سید سلیمان ندوی نے عہد جدید کا معلم اول بتایا ہے۔<sup>(۲۷)</sup> اس معلم اول کی عربی زبان و ادب میں فتوحات کا آغاز اس قصیدے سے ہوتا ہے جو انھوں نے سرسید کی جلالت شان کی تقدیم کے لیے منظوم کیا تھا۔ یہ صراحت لازمی ہے کہ علامہ شبلی کے سرسید سے پرانے گھریلو تعلقات تھے۔ ان کے والد محترم کے سرسید سے دیرینہ مراسم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بڑے بھائی مولوی اسحاق محمد اور اینگلو اور اینٹل کالج کے طالب علم تھے۔ چنانچہ علامہ کے والد محترم نے علی گڑھ کے سفر کا عزم کیا تاکہ بیٹے کی خبر لے سکیں نیز سرسید سے ملاقات بھی۔ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے علامہ بھی اپنے والد محترم کے ساتھ ہو لیے تاکہ محسن ملت کا وہ قریب سے دیدار کر سکیں، کیوں کہ والد محترم سرسید ہی کے مہمان ہوتے تھے۔ علامہ یہ نہیں چاہتے کہ دست بستہ اپنے سیدی کے حضور

۲۵۔ عبد الماجد دریابادی، ”شبلی انسان، مصنف، مصنف گر“، معارف، اعظم گڑھ (۱۹۶۵ء)، ۱۲۰-۱۲۲۔

۲۶۔ افادات مہدی میں ایک مضمون بعنوان ”ملک میں تاریخ کا معلم اول یعنی شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی“ ہے جس میں مہدی افادی نے علامہ کی تاریخ نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔ (دیکھیے: ایم مہدی حسن، افادیت مہدی، مرتبہ: مہدی بیگم (معاد پریس، بدون تاریخ)، ۲۱۸-۲۲۸)۔

۲۷۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی (اعظم گڑھ: دارالمصنفین، اکتوبر ۲۰۰۸ء)، ۷۔



کھڑے ہو جائیں، بلکہ اپنا ذرا نہ عقیدت ان کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کی ٹھانی اور عربی زبان میں ایک خوب صورت قصیدہ منظوم کیا۔<sup>(۲۸)</sup>

اس قصیدے میں سرسید کی خاندانی وجاہت کا ایک طرف ذکر ہے تو دوسری طرف ان کی علمی شان کا قصہ بھی چھیڑا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی معاشرتی اور تعلیمی تحریک کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں راقم الحروف یہ بھی کہنا چاہے گا کہ علی گڑھ کے تعارف اور اس کی تعریف میں علامہ کا قابل ذکر کردار رہا ہے جس کی شہادت ان کے مقالات، خطبات اور عربی و فارسی شاعری میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔<sup>(۲۹)</sup> افسوس تو اس بات کا ہے کہ سید صاحب نے اپنے استاد محترم کے بہت سے ان قصائد کو فارسی کلیات میں جگہ نہ دی جو کالج میں معروف شخصیات کی آمد پر کہے جاتے تھے۔ ان قصائد کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں سرسید کی اصلاحات اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور علی گڑھ تحریک کی نمائندگی کی گئی ہے۔ علامہ کے اس عربی قصیدے میں بھی سرسید کی تحریک کی افادیت پر آواز بلند کی گئی ہے۔ یہاں پورا قصیدہ بطور مسک الختام نقل کیا جا رہا ہے۔

المجد یصحب علما حیثما یصل  
والعلم عن قومنا لازال یرتحل  
بزرگی جہاں جہاں جاتی ہے، علم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے،  
حالاں کہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے۔

۲۸- ظفر الاسلام اصلاحی ”مولانا شبلی نعمانی اور علی گڑھ“، فکر و نظر، (علی گڑھ)، ۱۹۹۶ء، ۲۵۲-۲۵۳۔

۲۹- پاکستان کے معروف ادارے مجلس برائے تحقیق اسلامی و ثقافت کراچی کے مجلہ الایام نے علامہ شبلی نعمانی پر ایک گوشہ شائع کیا ہے، جس میں راقم الحروف کے چار مقالات اس طرح ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں: ۱- علامہ شبلی نعمانی اور عربی زبان و ادب، ۲- مکاتیب شبلی میں عربی زبان و ادب، ۳- تاریخ ترتیب قرآنی از علامہ شبلی نعمانی: ایک جائزہ، ۴- مکاتیب شبلی، بنام حبیب الرحمن خان شروانی: ایک جائزہ، دیکھیے: الایام، کراچی (جنوری-جون ۲۰۱۳ء)، یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر اورنگزیب اعظمی نے مجلہ مجلہ الہند کا ایک تحقیقی اور ضخیم شبلی نمبر نکالا ہے جو ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے اس نمبر میں خاکسار کا مقالہ ”العلامة شبلي النعماني و مساهمته في تطوير الدراسات العربية“ کے عنوان سے ہے۔ دیکھیے: مجلہ الہند،

بولفور بنغال الغریبہ، (نومبر-دسمبر ۲۰۱۳ء)، ۳۱۱-۳۲۶۔

نالوا من الذل ما لا ناله أحد  
 إذ لا يرى فيهم علم و لا عمل  
 ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہوئی  
 تھی، کیوں کہ اس میں نہ علم نظر آتا ہے نہ عمل۔

ولا تزال تری ينشت شملهم  
 في كل يوم وقد ضاقت بهم حيل  
 ان کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور ان کے لیے تمام راستے بند  
 ہو گئے ہیں۔

لا يرغبون إلى ماكان ينفعهم  
 فجّل صنعتهم للغيّ والخلط  
 مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان بھی نہیں ہے، ان کا تمام تر  
 کارنامہ گم راہی اور پریشان رائی ہے۔

تراهم اليوم في كآب وفي قلق  
 فلا أفاد فتیلا مابه اشتغلوا  
 آج تم ان کو رنج و غم میں مبتلا دیکھ رہے ہو ان کے مشاغل نے  
 ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا۔

لا ينتهون وقد ذاقوا وبالهم  
 عن سوء صنع فقد باؤا بما عملوا  
 باوجودے کہ اپنی بد اعمالیوں کا مزہ چکھ چکے، لیکن ان سے باز  
 نہیں آتے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔

وهل يجازيهم إلا بما اكتسبوا  
 من كان من عنده الأحكام تنفصل

خدا جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے اس کے سوا ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا۔

فمن سعی اليوم في إصلاح حالهم  
فالله جازيه يوم يقطع الأمل  
پس جس شخص نے ان کی اصلاح کے لیے کوشش کی، خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا۔

إن كنت تستلني من هذه صفته  
قلت الإمام الهمام السيد البطل  
اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہوں گا، امام سردار، بہادر، سید۔

هو الذي فاق في الآفاق منزلة  
ونال ما لم تنله الأعصر الأول  
وہ وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا، اور وہ بات حاصل کی جو  
قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

من أقبل الدين والدنيا عليه معا  
والآن في نجاح ما قد رام مشتغل  
جس کو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک اپنے مقاصد کی کام یابی میں مشغول ہے۔

نال المكارم من آباءه و مشى  
في المكرمات على آثار مافعلوا  
اپنے آبا و اجداد سے فضائل حاصل کیے اور اس شاہ راہ میں ان کے نقش قدم پر چلا۔

فجده سيد الأعراب و العجم  
 قد قال يا أمتي لما دنا الأجل  
 اس کے دادا عرب و عجم کے سردار تھے اور ان کی موت کا وقت  
 آیا تو صرف امتی کا لفظ ان کی زبان سے نکلا۔

وهكذا صُنِعَ هذا السيد العلم  
 يقول يا لهف قومي يسيء ما عملوا  
 اسی طرح اس نام و رسید نے کہا کہ افسوس میری قوم نے جو کچھ  
 کیا، برا کیا۔

يا خير من سيط حب القوم من دمه  
 أحسن ولا تبتئس من سوء ما عملوا  
 اے ان لوگوں میں بہتر جن کے خون میں قوم کی محبت پیوست  
 ہوگئی ہے، عمدہ کام کر اور جو برائیاں قوم نے کیں ان سے غم  
 زدہ نہ ہو۔

أحسن إليهم ولو جازوك سيئة  
 ولا تبال بما قالوا وما فعلوا  
 ان کے ساتھ احسان کر، گو وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو  
 کچھ وہ کہیں اور جو کچھ کریں اس کی پروا نہ کر۔<sup>(۳۰)</sup>



۳۰۔ سب سے پہلے علامہ کا یہ قصیدہ علی گڑھ گزٹ (مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء) میں شائع ہوا، وہیں سے حیات شہلی میں نقل کیا گیا  
 ۔ دیکھیے: سلیمان ندوی، حیات شہلی، ۱۲۲-۱۲۳۔